ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

مولانا بنوریؒ کی یاد میں

۱۸/اکتوبر ۱۹۷۷ء، ۴ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ کی صبح کو جب اخبار آیا تو بالکل غیر متوقع طور پر اس میں یہ خبر تھی کہ مولانا محمد یوسف بنوری گزشتہ روز دل کا دورہ پڑنے سے راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر نے ششدر کر دیا، میں چند ہی روز قبل آپ سے مل چکا تھا اور حالات حاضرہ پر گفتگو ہوئی تھی، کسی قسم کا وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ چند روز کے اندر ہم سے جدا ہو جائیں گے، ان کی تاریخ وفات تو اپنے رجسٹر میں وفیات للعاصرین کے تحت درج کر لی، مگر ساتھ ہی وہ سارا ماحول سامنے آ گیا جو مرحوم کی یاد اور حیات سے مربوط تھا، ذہن ان کی زندگی کے اوراق ماضی الٹنے لگا، میں مرحوم کی یاد میں چند سطریں قلمبند کرتا ہوں، مگر پہلے مجھے یہ بتانا پڑے گا کہ مجھے مرحوم سے تعارف وتعلق کیسے ہوا؟ اور ان کی شخصیت کس ماحول میں پروان چڑھی۔

یہ محض اتفاق سمجھئے کہ میں جنوری ۱۹۱۵ء کی ابتداء میں لدھیانہ میں تعین ہو کر چلا گیا وہاں پر، ''نواں محلّہ'' میں میری رہائش تھی، قریب ہی ''مولویوں کی مسجد'' تھی وہاں نماز کے لئے جانا ہوتا، اور وہاں کے بعض احباب سے اچھا خاصا تعارف بھی ہو گیا، میں اپنے گھر میں ''مسلک اہل حدیث'' کی طرف زیادہ مائل تھا، مگر ان حضرات کا مسلک دیوبندی تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے عزیز مولانا مفتی محمد نعیم دیوبند کے سند یافتہ تھے، ان حضرات سے بعض مسائل پر علمی گفتگو رہا کرتی۔

غالباً اکتوبر ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان میں سے ایک صاحب (غالباً مولانا حبیب الرحمٰن) میرے پاس تشریف لائے اور بتایا کہ: دیوبند سے چندا کابر تشریف لائے ہیں، میں ان سے ملاقات کروں۔ کہ یہ معاملہ بیان کرتے سنا کہ آپ کو علم نہیں کہ برٹش گورنمنٹ نے فتویٰ ضبط کر لیا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

چنانچہ ظہر کی نماز کے لئے میں وہاں گیا اور نماز کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن نے میرا ان حضرات سے

تعارف کرایا، اور میں نہایت ادب کے ساتھ ان کی گفتگو میں شامل ہوا، یہ حضرات علامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور مفتی عزیز الرحمٰنؒ (رحمۃ اللہ علیہم) تھے، معلوم ہوا کہ یہ حضرات دراصل حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیو بند کی آنکھیں بنوانے کے لئے یہاں سے ''موگہ'' ضلع فیروز پور تشریف لے جا رہے تھے۔

مجھے ان حضرات دیو بند سے تعارف وملاقات کا شرف پہلی مرتبہ حاصل ہوا تھا، میں اس نیک سعادت جماعت اور ان بزرگوں کی نورانی صورتوں کا نقشہ پیش کرنے سے قاصر ہوں، مجھے یاد ہے کہ اگلے دن میں ان حضرات کو ظہر کے بعد ریل پر چھوڑنے بھی میز بانوں کے ہمراہ گیا تھا، یہ حضرات نہایت عزت واحترام کے ساتھ حضرت مولانا حافظ محمد احمد مرحوم ومغفور کو ہمراہ لے کر لدھیانہ سے روانہ ہوئے، حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھیں ٹھیک ہوگئی تھیں اور ''موگہ'' سے واپسی پر وہ دیو بند چلے گئے تھے۔

غرض یہ کہ ان علماء سے اور مسلک دیو بند سے میرا پہلا تعارف تھا، اس کے بعد بندہ اس مسلک سے منسلک رہا، ہندوستان کی تاریخ میں کئی انقلاب آئے' مگر میرا شوق اور رجحان ان کی طرف بڑھتا گیا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا مفتی محمد نعیمؒ اور مولانا محمد یحییٰؒ کی مجلسوں میں علمائے ہند کی قربانیوں اور ان کے مصائب کے تذکرے ہوتے، جن سے معلوم ہوتا کہ علمائے دین نے کن کٹھن حالات میں کام کیا اور ان کو کن کن مصائب وتکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی ضمن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ علیہ اسیر مالٹا کا ذکر بھی آیا، جب آپ ۱۳۳۴ھ میں دوسرے حج پر گئے تو ۲۴ صفر المظفر ۱۳۳۵ھ کی صبح کو آپ کو جدہ میں گرفتار کر کے مالٹا لے جا کر نظر بند کر دیا گیا۔ تین برس سات ماہ نظر بند رکھنے کے بعد آپ کو ۸ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی لا کر رہا کیا گیا، اور خلافت کمیٹی نے بمبئی میں آپ کا استقبال کیا، اس طرح آپ ہندوستان پہنچے جو ایک طویل قصہ ہے۔

انہی دنوں' میں طویل چھٹی پر لدھیانہ سے لاہور آیا تو علامہ اقبال مرحوم کی محفل میں مولانا محمد علی جوہر نے مسکرا کر مگر افسوس کے لہجے میں کہا کہ ہمیں اس قسم کے قانون کو پہلے ہی نافذ تصور کرنا چاہئے جب کہ ہم برٹش گورنمنٹ کے زیر تسلط ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک اس قسم کا فتویٰ یا اس قسم کا قانون اسی روز سے نافذ سمجھنا چاہئے جب سے برٹش راج کا اس ملک پر تسلط قائم ہے۔

یہاں ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء کا زمانہ بڑے ابتلاء کا دور تھا' جمعیۃ العلمائے ہند نے جس کے سیکرٹری حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے تجویز کیا کہ لاہور میں ایک عام جلسہ منعقد کیا جائے، جس میں تمام مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء کو جمع کر کے ہندوستان کے

سیاسی حالات میں اسلامی آواز بلند کی جائے، اس کارروائی کے روح رواں مرحوم مولانا عبدالقادر قصوری وکیل تھے جو انگریزوں کے کٹر مخالف اور کسی قدر کانگریسی خیالات کے تھے۔ چنانچہ بریڈلا ہال لاہور میں یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ہونا قرار پایا، حضرت مولانا عبدالقادر قصوری نے اسی ہال کے اردگرد تمام مہمانوں کی رہائش کا خاطر خواہ انتظام کیا، قریب ہی کھانے کے کمروں کا انتظام کیا، اس جلسہ میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے علمائے کرام نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد رانچی جیل سے رہا ہو کر سیدھے لاہور پہنچے، انہوں نے خطبہ صدارت بھی راستے ہی میں اپنے مخصوص رنگ میں لکھا۔

جلسہ کا افتتاح تلاوت آیات قرآن کریم سے ہوا، تلاوت قاری محمد طاہر قاسمی مرحوم نے کی تھی، اس زمانہ میں کسی لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا نظام نہیں تھا' مگر میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام نقشہ بریڈلا ہال کا ہے جو کھچا کھچ ایک سرے سے دوسرے سرے تک حاضرین سے بھرا ہوا تھا، اور خاموشی' قرآن کریم کی تلاوت کے باعث ہر طرف چھائی ہوئی تھی، خاص کر مرحوم قاری محمد طاہر صاحب (برادر حقیقی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم) نے نہایت بلند آواز اور رقت کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی اس آیت کو ادا کیا اور سامعین میں خاموشی کے علاوہ رقت کا سماں تھا۔

﴿وما تلک بیمینک یموسی قال ھی عصای اتوکؤ علیھا واھش بھا علی غنمی ولی فیھا مارب اخری قال القھا یموسیٰ فالقھا فاذاھی حیۃ تسعیٰ﴾

حتیٰ کہ آپ نے تلاوت ختم کی تو پھر جلسہ کی کارروائی اس طرح شروع ہوئی کہ صدارت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو تجویز کیا گیا۔ بڑے بڑے علمائے کرام کی تقاریر ہوئی تھیں' چنانچہ اسی ضمن میں جو تقریر حضرت مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کی مجھے یاد ہے جس میں آپ نے حضرت امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا، جس میں آپ کو خلق قرآن کے ضمن میں سزا دی گئی تھی، اور آپ کے شانوں پر بوجھ رکھ دیا گیا تھا اور اسی حالت میں آپ کا تہبند کھلنے پر آ گیا تھا، اور کس طرح آپ نے باری تعالیٰ کے حضور میں دعا کی تھی، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس رقت سے اس واقعہ کو پیش کیا' وہ مجھے آج تک یاد ہے کہ تمام اطراف سے آہ و بکا کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا جو انہوں نے دوران سفر گاڑی میں لکھا تھا، اس کا کچھ حصہ مولانا کے سیکرٹری عبدالرزاق ملیح آبادی نے پڑھا اور اس کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا تھا اسے مولانا محمد حلیم انصاری نے پڑھا تھا، اس خطبہ صدارت میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تاریخ اسلام کی درخشانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلامی اندلس کی سلطنت کا ذکر اس طرح کیا تھا کہ جب عیسائیت نے ملک پر قبضہ کر لیا تو

مساجد کو گرجے بنادیا گیا تھا کیوں کہ ابھی مسلمان اندلس میں موجود تھے‘ اگرچہ ان کی سلطنت نہ تھی ...... اس واقعہ کو ایک عربی قصیدہ میں ابن بدروان نے بیان کیا ہے جو اتفاق سے مولوی حلیم انصاری کو یاد تھا اس نے مولانا ابو الکلام کے متن خطبہ کو ایک طرف کر کے اپنے رنگ میں جو ایک بدوی عرب کا ہونا چاہئے اور ہاتھ میں ایک عصا لے کر اس قصیدہ کو ایک عرب کی طرح پڑھا، میں دیکھ رہا تھا کہ سب طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور مولوی حلیم انصاری کو لوگ سن رہے تھے، متن خطبہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار پیام میں چھپ گیا تھا۔

میں نے اس کے بعد آج تک ایک جگہ علمائے دین کا اتنا بڑا اجتماع نہیں دیکھا‘ جس میں ہر خیال کے علماء کرام ایک مقصد کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ جب میں علامہ اقبال کے ہمراہ دروازے کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سامنے سے حضرت مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے تھے، علامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس سے پہلے تعارف نہیں تھا، میں نے اسی جگہ دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ دونوں صاحبان نے ملاقات کی تمنا کا اظہار بھی اس وقت کیا‘ میرا خیال ہے کہ جلسے میں دونوں ایک دوسرے کے قریب ہی بیٹھے تھے، اس جلسہ کی کارروائی کا ایک ایک منظر مجھے ابھی تک یاد ہے، ان تفصیلات کو چھوڑتا ہوں۔ میں چونکہ حضرت شاہ صاحب سے بیعت تھا‘ اس لئے ان کی فرودگاہ میں اکثر حاضر رہتا، میں نے دیکھا کہ ہر دو صاحبزادے طیب (مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور طاہر بچوں کی طرح ان کے اردگرد رہتے تھے اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں سے شفقت اور پیار فرماتے تھے، اور علمائے کرام کا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گرد مجمع رہتا تھا‘ اسی جلسہ میں واں بھچراں کے مولانا حسین علی صاحب کو دیکھا ان کی شخصیت ایک تو ان کی بزرگی کی وجہ سے بہت نمایاں تھی، اور دوسرے وہ اپنے قد اور ڈیل ڈول میں بھی ممتاز تھے۔

ان متذکرہ بالا واقعات کے بعد ایک مرتبہ حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے تو میرے مکان کے قریب پیر عبدالغفار شاہ صاحب مرحوم کی مسجد تکیہ سادھواں میں فروکش ہوئے‘ آپ نے پہلے اردو میں سادہ سا وعظ فرمایا، پھر آپ نے دیکھا کہ بعض نو وارد کشمیری صاحبان بھی اس مجلس میں موجود ہیں تو آپ نے کشمیری زبان میں بھی وعظ فرمایا۔ اور سب لوگ محظوظ ہوئے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لاہور میں تشریف آوری کا علم جب علامہ اقبال مرحوم کو ہوا تو کوشش کی کہ آپ کسی طرح انجمن حمایت اسلام میں ہی رہ جائیں، علامہ اقبال مرحوم کا یہ بھی خیال تھا کہ بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبول فرمائیں، یہ ساری پیش کشیں میری وساطت سے ہوئیں، اور میں حضرت شاہ صاحب کو علامہ اقبال کے ہاں بھی لے گیا تھا، مگر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چیزیں قبول نہیں فرمائیں۔

اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے انجمن خدام الدین کے تحت ایک بہت بڑے جلسے کا انتظام کیا۔ اس جلسہ کی صدارت حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، اور اسی جلسہ میں آپ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ کو علمائے کرام کا قائد (امیر شریعت) مقرر کیا اور خود بھی ان کو قائد تسلیم کیا۔ علامہ اقبال مرحوم ومغفور کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کی تشریف آوری کی اطلاع ہوئی تو علامہ اقبال نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط لکھا:

''لاہور: ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ مولانا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے ماسٹر عبداللہ صاحب سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے، میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا' اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں، آپ کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی۔ حضرت مولوی شبیر احمد صاحب، اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضہ کو شرف قبولیت بخشیں گے، آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔

مخلص محمد اقبال''

حضرت سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی خط کی پشت پر دعوت قبول کرنے کا جواب لکھ دیا۔ اور دوسرے روز بندہ علامہ کے ہاں سے موٹر لے کر مولانا محمد علی لاہوریؒ کے ہاں چلا گیا اور مولانا احمد علی سمیت ان بزرگوں کو لے کر آیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس دعوت میں شریک تھے، اس موقعہ پر کئی مسائل پر بہت عمدہ اور طویل گفتگو ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز علامہ کے ہاں ایک صاحب نے (جو فوجی تھے اور کسی بڑے عہدہ پر فائز تھے) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بعض سوالات کئے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ اخبارات میں علامہ مشرقی کے ''تذکرہ'' پر ایک تبصرہ شائع ہوا ہے' وہ کن صاحب نے لکھا ہے؟ علامہ نے چودھری محمد حسین کی طرف (جو کہ مجلس میں موجود تھے) اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

اس مجلس میں ''مسئلہ سود'' پر سیر حاصل گفتگو ہوئی، حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

قرآن کریم میں صاف الفاظ میں فرمایا ہے:﴿واحل الله البیع وحرم الربو﴾ (البقرہ:۲۷۵)

جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اور حلال کیا اللہ نے بیچنا اور حرام کیا سود کو۔''

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس آیت میں واضح الفاظ ہیں، اور کوئی ایسا معمہ نہیں ہے جس کی تعبیر کوئی اور ہو سکے، یا اس کے معانی میں کسی اختلاف کی گنجائش ہو۔ اس مجلس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خوب حصہ لیا۔ اور ان کے لطائف واشعار سے لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد مدرسہ دیوبند میں کچھ تغیر آیا، اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل چلے گئے، ان دنوں علامہ اقبال بھی چاہتے تھے کہ آپ کسی طرح لاہور آ جائیں' مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے، یہ ایک طویل قصہ ہے۔

اس عرصہ میں مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ ۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا' وہاں اس زمانہ میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی مقیم تھے، وہ وہاں ضعف وعلالت کے باوجود مدرسہ دیوبند کی مالی مشکلات کے سلسلہ میں گئے تھے، وہاں سے دیوبند واپسی کے دوران نظام آباد ریلوے اسٹیشن پر ۱۱۸کتوبر ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا، میں بھی اتفاق سے حیدرآباد میں تھا، اور مجھے یاد ہے کہ سرکار نظام کے خاص فرمان سے حیدرآباد کے قبرستان کے اس حصہ میں جو ''خطۂ صالحین'' کے نام سے مشہور تھا، ان کی تدفین ہوئی اور ''مغفور ہوئے۔'' تاریخ وفات نکالی گئی۔

میں حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے ایک مرتبہ دیوبند گیا، مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ ڈابھیل سے کچھ دنوں کے لئے دیوبند تشریف لائے ہوئے ہیں' یہ زمانہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۲۹ء کا ہے، مگر جب حضرت شاہ صاحب کے مکان پر دیوبند پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ دہلی تشریف لے گئے ہیں، وہاں میری ملاقات ایک نوجوان طالب علم سے ہوئی جو بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا' اس نے مجھے حضرت کے دہلی تشریف لے جانے کی اطلاع دی اور اسی نے مجھے حضرت کے گھر سے کھانا لا کر کھلایا۔ یہ نوجوان حضرت کا تلمیذ تھا اور غالباً اسی سال فارغ التحصیل ہوا تھا، اس نوجوان پٹھان کے ہمراہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے مکان کے بالمقابل شمال کی طرف جو مسجد ہے' اس میں ظہر کی نماز ادا کی، اس مسجد کی پیشانی پر ایک قدیم کتبہ تھا، میں نے حسب عادت اسے پڑھنے کی کوشش کی، مگر اس کا ایک لفظ پڑھا نہیں گیا، میں نے اس نوجوان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ محلّہ میں کہیں سے سیڑھی تلاش کرلائے۔ وہ نوجوان سیڑھی لے آیا اور میں نے سیڑھی پر چڑھ کر اس کتبہ کے مشکل حصہ کا چربہ کسی طرح لے لیا اور پھر اس کتبہ کے متن کو میں نے لاہور آ کر کافی کوشش اور مرحوم پروفیسر محمود شیرانی کی مدد سے

پڑھا، میں یہ ساری کہانی ''معارف اعظم گڑھ'' فروری ۱۹۳۲ء کے پرچہ میں شائع کراچکا ہوں۔ اس نوجوان پٹھان نے جس کا میں پہلی بار مہمان بنا، اور جس کی مدد سے میں نے اس کتبہ کا چربہ لیا، اپنا نام ''یوسف'' بتایا۔ یہی ہمارے مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ چنانچہ ''معارف'' کے اس مضمون میں مولوی محمد یوسف صاحب کا بھی ذکر ہے۔ اور اس کتبہ کا متن حسب ذیل ہے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ بنا شد ایں مسجد در عہد سلطان السلاطین، نور حدقہ شہر یاری، مہر سپہر سلطنت و کامگاری، شہنشاہ عادل ابوالمظفر محمد جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ۔ اہتمام فقیر حقیر مرزا بیگ ابن خواجہ علی محبّ بخشی۔ شہر صفر سنہ نوصد وشصت و پنج از ہجرۃ۔''

یعنی یہ مسجد ۹۶۵ھ میں اکبری عہد کے دوسرے سال تعمیر ہوئی، چونکہ اس کتبہ میں بعض الفاظ ایسے تھے جو مشکل سے بعد میں پڑھے گئے، اس لئے اس کتبہ سے متعلق کئی امور تاریخی طور پر بھی اس وقت مطالعہ میں آئے تھے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ علاقہ اس وقت بھی سرکاری سہارنپور میں اسی دیوبند کے نام سے تھا، جیسا کہ ''آئین اکبری'' میں لکھا ہے (مطبوعہ کلکتہ ص ۸۲۴) البتہ بانی مسجد میرزا بیگ ابن خواجہ علی محبّ بخشی کا تذکرہ نہیں مل سکا۔

الغرض مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہ سے اس طرح تعارف ہوا اور پھر حضرت قبلہ سید انور شاہ قدس اللہ سرہٗ کے تلمیذ ہونے کی وجہ سے ان سے ایک طرح کا رابطہ اسی وقت قائم ہوگیا جو ہمیشہ قائم رہا، اور ان سے نہایت بے تکلفی بھی اسی رابطہ کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد مولانا سید محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے، بعد میں ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء ۱۳۵۲ھ کو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا دیوبند میں انتقال ہوگیا۔

میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک ہندوستان سے باہر (پیرس میں) رہا۔ اور جب واپس آیا تو مجھے پونہ کے دکن کالج میں ملازمت مل گئی، مجھے اس کا علم تھا کہ مولانا محمد یوسف ڈابھیل میں ہیں۔ قیام پونہ کے دوران ایک مرتبہ میں محض ان سے ملنے ڈابھیل گیا، رات وہاں رہا، بھائیوں کی سی بے تکلفی سے علمی گفتگوئیں ہوئیں۔ اسی قیام پونہ کے دوران ایک مرتبہ مولانا محمد یوسف صاحب اپنے ایک رفیق کے ساتھ، جن سے میں واقف نہیں تھا، پونہ تشریف لائے، میرے لئے ان کی آمد گویا عید کا چاند تھی۔ مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، غریب خانہ پر ان کا قیام رہا، اور وہ وقت جس مسرت سے گزرا آج تک نہیں بھولتا، ان کے پاس حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ والا قرآن مجید تھا۔ وہ میں نے ان سے لے لیا۔ اور باصرار اس کا ہدیہ بھی دیا، یہ آج تک ہمارے گھر میں موجود ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا، دنیا کے حالات بدل گئے۔ میں بھی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں لاہور چلا آیا، ۱۹۴۹ء میں شاہ ایران کی پاکستان میں آمد ہوئی، اور کشمیر کے سلسلہ میں ایک نمائش اور کانفرنس کراچی میں ہوئی، میں اس میں شرکت کے لئے پروفیسر قاضی ظہیر کے ہمراہ کراچی گیا۔ اتفاق سے وہ جگہ جو اس مقصد کے لئے معین کی گئی تھی، موجودہ نیوٹاؤن جامع مسجد کے مشرق میں تھی، راقم الحروف، قاضی ظہیر اور دیگر حضرات وہاں فردکش تھے، مگر اس وقت اس نیوٹاؤن، جامع مسجد کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ البتہ اس جگہ بعض لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں ضرور رہتے تھے اور ایک بے سروسامانی کا سماں تھا، اس واقعہ کے بعد میرے احباب میں پیر حسام الدین راشدی کا اضافہ ہوگیا، ان کا مکان موجودہ نیوٹاؤن جامع مسجد کے قریب جمشید روڈ پر تھا، میرا آنا، جانا ان کے یہاں بکثرت رہتا تھا، میرے دیکھتے دیکھتے اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، اور شمال کی طرف ایک دو کمروں کا انتظام ہوا۔ مسجد کا رقبہ بہت وسیع تھا۔

حاجی عبدالمجید صاحب جو میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے، وہ اس مسجد کے منتظم نظر آتے تھے۔ جہاں آج مسجد کا صحن ہے، یہ حصہ بہت ہی نیچا بغیر فرش کے تھا، ان شمال کے کمروں میں خواجہ وحید بھی موجود رہتے تھے، وہ ان دنوں قریب ہی کسی سرکاری مکان میں رہتے تھے، علماء میں سرحد کے ایک مولانا لطف اللہ صاحب سرحدی پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ایک دن مسلک دیوبند پر ان سے مفصل گفتگو بھی ہوئی۔

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ مولانا محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہٗ بھی وہاں تشریف فرما ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ہجرت کر کے مستقل طور پر یہاں آ گئے ہیں، اور وہی اس مدرسہ کے روح رواں ہیں، ان کے ساتھ اکثر مجلسیں رہتیں، اور ان مجلسوں میں مولانا عبدالحق نافع بھی شریک ہوتے، وہ بھی اس مدرسہ میں استاذ تھے۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے میں خصوصیت سے صبح کی نماز ذرا زیادہ پابندی کے ساتھ یہاں آ کر ادا کرتا، اس زمانہ میں صبح کی نماز مولانا عبدالقیوم صاحب پڑھاتے تھے، ان کی قرأت ذرا طویل اور بلند ہوتی تھی، ان کی اقتداء میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی نماز پڑھتے، ایک خاص سماں پیدا ہو جاتا۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ صبح کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا درس قرآن کریم ہوتا، جس سے میں اکثر استفادہ کرتا، وہ نہایت عمدگی سے مسائل کو ذہن نشین کراتے تھے، مگر اِملا نہیں کراتے تھے۔

آہستہ آہستہ اس مسجد کا بازار والا جنوبی حصہ بھی مکمل ہوگیا، جس میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش کا انتظام بھی تھا، مسجد کا حوض اور دیگر حصے بعد میں تیار ہوئے، اسی طرح مسجد کا صحن بھی دالان کی سطح کے برابر ہوگیا، میں جب بھی کراچی جاتا، صبح کی نماز بڑے اہتمام اور پابندی سے اس مسجد میں ادا کرتا اور اگر مغرب کی نماز بھی وہاں میسر آتی تو اسے غنیمت سمجھتا۔ ایک روز میرے دوست پیر حسام الدین راشدی صاحب مجھ سے

کہنے لگے کہ اس مسجد کی کیا خصوصیت ہے کہ تم بھاگم بھاگ وہاں جاتے ہو؟

میں نے ان سے کہا کہ نماز کے علاوہ میں وہاں مولانا محمد یوسف کی زیارت وملاقات کرتا ہوں اور اس طرح مجھے حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز کا زمانہ یاد آجاتا ہے اور مجھے ان کی جھلک ملتی ہے۔

یہ سن کر میرے دوست پیر حسام الدین راشدی نے شام کو کھانے پر مولانا محمد یوسف بنوری کی دعوت کی، دعوت کا پیغام بھی میرے ہی توسط سے بھجوایا، میں نے جب مولانا مرحوم سے دعوت کا پیغام زبانی عرض کیا تو فرمانے لگے: اگر آپ نے ان سے طے کرلیا ہے یا خود ان کی طرف سے دعوت ہے تو میں ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد میں مولانا محمد یوسف صاحب کو پیر حسام الدین راشدی کے ہاں لے آیا۔ کھانے کے دوران اور بعد میں بھی حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت ہی بے تکلف ہوکر بعض مسائل پر اور بعض دنیاوی امور پر گفتگو کی، خاص کر مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز وضو اور طہارت کے موضوع پر راشدی صاحب کے سامنے ایک عجیب وغریب تقریر فرمائی۔

اسی مجلس میں آپ نے ''بنور'' کا ذکر کیا اور ''بنوری'' کی وجہ تسمیہ بتائی، یہ اطلاع میرے لئے بھی نئی تھی۔ ''بنور'' ریاست پٹیالہ میں سرہند کے قریب ایک قصبہ کا نام ہے' جہاں کے حضرت سید آدم بنوری قدس اللہ سرہٗ العزیز مشہور ہیں، اسی نسبت سے آپ کو پاکستان کے اکثر احباب ''مولانا علامہ سید محمد یوسف بنوری'' کے الفاظ سے جانتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ اسلامی ودینی حلقوں میں مشہور شخصیت ہیں' آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے خلفائے نامدار میں سے تھے اور اس دور کے مشاہیر بزرگوں میں سے تھے' ان کی کرامات وغیرہ کے اکثر قصے لوگ بیان کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ ہندوستان سے افغانستان جاتے ہوئے سرائے اکوڑہ پہنچے' جہاں آپ نے حضرت شیخ المشائخ رحمکار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ملاقات کی۔

پنجاب یونیورسٹی میں دسمبر ۱۹۵۷ء اور جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک کولوکیم (مجلس مذاکرہ) ہوئی' اس میں مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ نے بھی بطور مندوب شرکت کی اور عربی میں تقریر فرمائی۔ ان کی تقریر ''الاجتهاد فی الاسلام'' کے موضوع پر تھی، ان کی یہ تقریر منتظمین جلسہ کے منشاء کے خلاف تھی، اور وہ کچھ ایسا انداز ظاہر کررہے تھے کہ گویا آپ کو تقریر کرنے کے لئے نہیں بلایا گیا تھا، مگر یہ تقریر مصر کے علماء اور دیگر مندوبین اور شرکاء جلسہ نے پسند کی تھی۔ میرے خیال میں یہ تقریر طبع ہوچکی ہے۔

میں نے ایک روز ایک خاص مسجد کے سلسلہ میں جو نئی تعمیر ہوئی تھی اور اس میں اسلامی مسلک کے خلاف

کچھ بدعات کی گئی تھیں ''اسلام میں نقشہ مسجد'' کے بارے میں گفتگو کی، موصوف نے مجھے ایک خاص مفتی اور عالم سے مشورہ کے لئے کہا' تاہم وہ مجھے اپنے مکان میں لے گئے اور ایک مطبوعہ کتاب ''بغیة الاریب فی مسائل القبلة والمحاریب'' عنایت کی جو ڈابھیل سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی' اگرچہ میرے زیر بحث سے اس کتاب میں تعرض نہیں کیا گیا، اس لئے میری ضرورت اس سے پوری نہ ہوئی، لیکن ایسے ادق مسائل پر ان کی تصنیف دیکھنے سے ان کی علمی قابلیت کا مزید اندازہ ہوا، ان کی یہ کتاب عربی میں ہے اور نیوٹاؤن جامع مسجد کے عظیم الشان مدرسہ کی تعلیمی وانتظامی ذمہ داریوں کے باوجود ان کی عربی کتابیں بھی نیوٹاؤن سے شائع ہوتی رہی ہیں۔

آپ اکثر حرمین شریفین حاضر ہوتے تھے اور وہاں جن علمائے کرام سے تعلق وتعارف ہوتا اکثر ان کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے۔ ایک روز آپ نے مجھ سے ایک عالم کا ذکر کیا جو غالباً الجیریا کا باشندہ تھا' آپ نے اس کی تعریف کی۔ چنانچہ جب ۱۹۶۷ء میں میں عمرہ کے لئے مکہ معظّمہ گیا تو میں نے حرم شریف میں ایک عالم کو دیکھا کہ وہ عربی زبان میں حدیث شریف کا درس دے رہا ہے' میں نے محسوس کیا کہ شاید یہ وہی صاحب ہیں جن کا ذکر مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ نے کیا تھا، واقعی وہ شخص کتب حدیث کا ماہر اور حافظ حدیث معلوم ہوتا تھا، افسوس کہ میں اس کا ذکر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں کرسکا۔

مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے والد مرحوم تھوڑا عرصہ ہوا فوت ہوئے ہیں، میں ان سے دو مرتبہ ملا ہوں، ایک دفعہ تو مولانا کے ہمراہ لاہور میں ملاقات ہوئی اور ایک مرتبہ جامع مسجد نیوٹاؤن کراچی میں صبح کی نماز کے بعد ملاقات ہوئی اور دیر تک ملاقات رہی، مولانا محمد یوسف صاحب کے حکم پر صبح کا ناشتہ بھی ان کے ساتھ کیا۔ بڑی طویل علمی گفتگو رہی، مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے، دونوں باپ، بیٹا بالکل ایک دوسرے کے مشابہ عالم دین تھے، کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، بلکہ دونوں ایک ہی مدرسہ کے مدرس معلوم ہوتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ان کو شکل وصورت اور عقل وذہانت ایسی عطا فرمائی تھی کہ جو فوراً ظاہر ہو جاتی تھی۔

میرے عزیز دوست راشدی صاحب اپنا مکان تبدیل کرکے نیوٹاؤن جامع مسجد سے کہیں دور جا رہے، اس لئے آخری مرتبہ جب میں کراچی میں تھا تو جمعہ کی نماز کے لئے ذرا دیر سے پہنچا، نماز سے فارغ ہوکر حسب عادت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا خیال ہوا' کیونکہ ان سے ملے کئی روز ہوچکے تھے۔ ویسے ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہوکر طبیعت میں ایک ولولہ بھی تھا۔ کہ اس ضمن میں ان سے گفتگو کی جائے، چنانچہ ان کی تلاش میں ان کے دولت کدہ پر پہنچا، آپ تشریف فرما تھے اور کچھ احباب آپ کے اردگرد بیٹھے تھے' میں نے دستک دی تو ایک صاحب نے دروازہ کھولا۔ اور مجھے نیا آدمی، اور دنیادار سمجھ کر ذرا بے اطمینانی کا اظہار کیا، مگر

آپ نے اطلاع ہونے پر فوراً اندر بلالیا۔ چونکہ عذر کی وجہ سے مجھے فرش پر بیٹھنے میں تکلف ہوتا ہے' اس لئے میرے واسطے ایک کرسی منگوالی، میں نے بے تکلفی کے انداز میں ان سے خیر خیریت دریافت کی تو حاضرین کو اچنبھا سا محسوس ہوا، اتنے میں مولانا عبیداللہ بن مولانا مفتی محمد حسن صاحب جامعہ اشرفیہ لاہور، لے بھی آ گئے۔ ان سے بھی علیک سلیک کے بعد خیر خیریت دریافت کی وہ کسی مہم پر گئے تھے اور اس کا نتیجہ حضرت ؒ کو بتا رہے تھے۔

یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ آپ نے ''ردقادیانیت'' میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اور بحیثیت ایک ادارہ کے اس میں کامیابی حاصل کی ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے خاموشی سے جو خدمات انجام دی ہیں' ان کا عوام کو کم علم ہے۔

الغرض میں دیکھتا ہوں کہ مولانا کس طرح ایک غیر معروف سے گاؤں میں پیدا ہوئے، اور پھر کس طرح اور کن حالات میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نوراللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے پہنچے، کن حالات میں آپ اور آپ کے رفقاء ڈابھیل گئے اور دین اسلام کی خاطر وہاں انہوں نے کس طرح تالیف وتصنیف کا سلسلہ رکھا، پھر پاکستان بننے کے بعد وہ کس طرح اندرون سندھ رہے، اور کس طرح کراچی میں عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔

وہ ستر برس کی عمر میں اسلامی نظریاتی کی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اور راولپنڈی میں دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہوئے، ہزارہا اشخاص نے راولپنڈی اور کراچی میں آپ کے جنازہ میں شرکت کی اور آپ کے قائم کردہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں آپ کو سپرد لحد کیا گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کی رحلت سے پیدا ہونے والا خلا پر نہیں ہو سکے گا، آپ کو دیکھ کر حدیث نبوی (ﷺ) **العلماء ورثة الانبیاء** کی تصدیق ہوتی تھی۔

> ''اسلام علیم وخبیر اور سمیع وبصیر رب العالمین جل ذکرہ کی طرف سے نازل کردہ دین ہے۔ چند عقلاء وحکماء کے ذہنی ادراک کا نتیجہ نہیں۔ نہ قانون ساز اداروں یا قوم کے چند نمائندوں کی دماغی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ یہ اس علیم خبیر کی قدرت کاملہ اور رحمت شاملہ کا ظہور ہے جو ہر دور، ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے انسانوں کا خالق ہے، جو پوری انسانیت کے حقیقت امراض سے باخبر ہے۔ اس کی واقعی ضروریات سے واقف اور اس کی دقیق نفسیات کا راز دان ہے۔'' (بصائر وعبر، ذوالقعدہ ۱۳۸۸ھ)